مرزائیت ـــــ دینِ عجم کا تسلسل

ایک چونکا دینے والا علمی و عمرانی تجزیہ

اسلام میں فتنوں کا ظہور قرونِ اولیٰ ہی سے ہو گیا تھا۔ مسیلمہ کا فتنہ اپنی قسم کا پہلا فتنہ تھا اور مرزا غلام احمد قادیانی کا ادّعائے نبوت صدرِ اوّل کے اسی فتنے کی ایک ترقی یافتہ صورت معلوم ہوتا ہے۔ اس زنجیر کی درمیانی کڑیوں کے بیچ و خم میں وہ تمام تحریکیں آجاتی ہیں۔ جو اسلام اور دوسرے مذاہب کے تصادم سے پیدا ہوئیں اور جن کی تاریخ مسلمانوں کی سیاسی قوت کے زوال اور اسلامی عقائد میں عجمی خیالات کی آمیزش کی تاریخ ہے دراصل خود قادیانی تحریک بھی اپنی ہیئت و ترکیب کے اعتبار سے مسیلمہ کذاب کے فتنے کے بجائے ان فتنوں سے زیادہ تعلق رکھتی ہے۔ جن کا بیج مسلمانوں کی غیر ملکی فتوحات کے زمانے میں بویا گیا۔ مسیلمہ کا دعوائے نبوت قبائلی رقابت کا نتیجہ تھا۔ اور ان عجمی تحریکوں کو مفتوح اقوام کے نسلی تعصب، کھوئی ہوئی حکومتوں کو حاصل کرنے کی خواہش اور یہودیوں اور مجوسیوں کے فکری رجحانات کی مخلوق سمجھنا چاہئے۔

اسلام نے اپنے ظہور کے ابتدائی سنین میں آہستہ آہستہ ترقی کی تھی۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں جو لوگ مسلمان ہوئے انہیں دربارِ نبوت میں رہنے اور اسلامی عقائد کو اچھی طرح سمجھنے کا موقع ملا تھا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے انتقال کے بعد فتوحات کا سیلاب اُمڈا۔ اور روم و ایران اور مصر کی بادشاہتوں کو خس و خاشاک کی طرح بہا کر لے گیا۔ اس عہد میں لوگ نہایت کثرت سے مسلمان ہوئے ہر طرف يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ اَفْوَاجًا کا منظر دکھائی دینے لگا۔ ان لوگوں میں اکثر ایسے تھے جو اپنے آبا و اجداد کے اکثر معتقدات اور اپنی قومی روایات ساتھ لے آئے مشرکین کے بعد یہود اور نصاریٰ سے واسطہ پڑا اور ان لوگوں کے متعلق علامہ ابن خلدون کا یہ قول نقل کر دینا کافی ہے۔ کہ ان میں سے اکثر ایسے تھے جنہوں نے اسلام کو کوئی نیا دین سمجھ کر قبول نہیں کیا تھا کیونکہ اسلام انبیاءؑ اور صحفِ سابقہ کی تصدیق کرتا ہے۔ اور خود کو کوئی نیا دین نہیں بلکہ موسیٰ و عیسیٰ علیہما الصلوٰۃ والسلام کا دین کہتا ہے۔ اس لئے یہ لوگ اسلام قبول کر لینے کے باوجود بعض ایسے عقائد پر جمے رہے جو ان کے مقتدایانِ مذہب نے خود پیدا کر لئے تھے اور جنہیں ان کے اصل دین سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

اسرائیلیات کا دفتر جس سے علمائے حق نے مسلمانوں کو بچنے کی تلقین کی ہے۔ انہیں لوگوں کی تفسیر و عقائد کی کتابوں کا جزو بن گیا۔ یہود و نصاریٰ کے بعد مسلمان ایمان نویں، زرتشتیوں اور مزدکیوں سے روشناس ہوئے۔ ان لوگوں کو اپنی نسل اور وطن کی عظمت کا بڑا غرور تھا۔ اور وہ یہودیوں کی طرح اپنے کو کائناتِ انسانی کی برگزیدہ ترین قوم اور مذہب کو ایک قومی متاع سمجھتے تھے۔ اس لئے ان میں کچھ لوگ تو ایسے تھے جو مسلمانوں کے غلبے کے بعد بھی اپنی قومی سلطنت کے قیام کی تدبیروں اور اندرونی سازشوں میں مصروف رہے۔ ان کے علاوہ ان میں بہت بڑی تعداد ان لوگوں کی تھی جنہوں نے اسلام تو قبول کر لیا۔ لیکن ہمیشہ اسلامی عقائد کو اپنے آباء و اجداد کے عقائد سے تطبیق دینے کی سعی کرتے رہے۔ اسی سعی و تطبیق میں ان کے عقائد اسلام اور مجوسیت کا ایک عجیب و غریب مجموعہ بن کر رہ گئے جسے نہ تو خالص اسلام کہا جا سکتا ہے اور نہ کوئی دوسرا نام دیا جا سکتا ہے۔ سب سے پہلے خدا کے تصوّر کے متعلق گمراہی پھیلی۔ پھر رسالت و امامت وغیرہ مسائل میں موشگافیاں ہونے لگیں۔ اسلام نے خدا کی تنزیہ و توحید کا جو تصوّر پیش کیا ہے۔ اس سے منکرِ انسانی بالکل نا آشنا تھی۔ یہودی ایک حد تک خدا کے تجسّم اور تشبیہ کے قائل تھے۔ عیسائی اس معاملے میں توریت کے متبع تھے۔ مجوسیوں نے الوہیت کو خیر و شر کی دو متقابل قوتوں میں تقسیم کر رکھا تھا۔ اور خدا کی صفات میں تجسّم و تشکل پر بھی اعتقاد رکھتے تھے۔

سب سے آخر میں مسلمانوں کو بودھوں اور ہندوؤں سے سابقہ پڑا۔ اور تناسخ۔ موکھش، کرم کانڈ اور نروان وغیرہ مسائل ان کے سامنے آئے۔ چونکہ بودھ۔ ہندو اور مجوسی ایک ہی درخت کے برگ و بار ہیں۔ اس لئے خدا کے اور اپنے اساسی عقائد میں بہت حد تک ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں۔ اس لئے خدا کے تجسّم و حلول کے عقیدے کو جو تمام مذاہب میں مشترک تھا۔ مختلف شکلوں میں نمودار ہونے اور پھیلنے کا موقع مل گیا۔

اگرچہ امویوں کے عہدِ حکومت ہی میں اسلامی عقائد کی توجیہ و تعبیر کا سلسلہ شروع ہو گیا تھا۔ لیکن چونکہ اس وقت تک عربوں کی قدیم سادگی اور دینی عصبیت بہت حد تک برقرار تھی۔ اس لئے عجمیوں کے مخصوص افکار کو چنداں فروغ حاصل نہ ہوا۔ عباسیوں کے عہد میں اباحت و مطلق العنانی کی ہوا زور سے چلنے لگی۔ انہوں نے ایرانیوں کی مدد سے تخت و تاج حاصل کیا تھا۔ دعوتِ عباسی کا سب سے بڑا نقیب ابو مسلم خراسانی خود انہیں لوگوں میں سے تھا۔ جو ایران میں ایک قومی حکومت قائم کرنے کے آرزومند تھے۔ اگرچہ

اسے اپنے ارادے میں کامیابی نہیں ہوئی۔ لیکن حکومت میں مجمی اثر و نفوذ حد سے زیادہ بڑھ گیا۔ اسی زمانے میں بودھوں اور ہندوؤں سے مسلمانوں کے تعلقات قائم ہوئے۔ عباسیوں کے عہد میں بودھوں اور ہندوؤں کو بہت فروغ حاصل ہوا۔ چنانچہ برامکہ جن کی فیاضی کے تذکروں سے کتابیں بھری پڑی ہیں۔ ابتدا میں بدھ مت کے پیرو تھے۔ مامون الرشید کے عہد میں ہندوستان کے فلسفی اور طبیب بھی بغداد پہنچے۔ ان تعلقات کی وجہ سے نئے نئے مباحث پیدا ہوئے اور عربوں کی طبیعتیں نئے نئے سانچوں میں ڈھلنے لگیں۔

مجوسیوں نے منصور عباسی کے عہد میں اپنے عقائد کی تبلیغ شروع کر دی تھی۔ راوندیہ جو حلول اور رجعت کے بڑے پرجوش مبلغ تھے۔ اسی زمانے میں پیدا ہوئے۔ یہ لوگ سمجھتے تھے کہ منصور کے جسم میں خدا کی روح اور اس کے وزیر عثمان بن نائلیک کے قالب میں جبریل کی روح حلول کر گئی ہے۔ بعد کے زمانے میں اس قسم کے عقائد کبھی تو شیعیت کی راہ سے آئے۔ کبھی تصوف کے لباس میں ظاہر ہوئے اور کبھی انہوں نے مدعائے الوہیت اور رسالت کی صورت میں نمودار ہو کر فساد پیدا کر دیا۔ عبیداللہ مہدی اور حسن بن صباح کی اسمٰعیلی دعوت نے شیعیت کو مجوسی عقائد کی تبلیغ کا واسطہ قرار دیا۔ حسین بن منصور حلاج نے، جس کے خیالات پر ہندوؤں کے فلسفے کا بھی گہرا اثر پڑا تھا، تصوف کے پردے میں وحدتِ وجود اور حلول وغیرہ عقائد کی تبلیغ کی۔ اور بابک خرمی اور مقنع خراسانی وغیرہ نے ادعائے الوہیت اور رسالت کا علم بلند کر کے حکومت کے خلاف علانیہ بغاوت کر دی۔ معتصم کے مشہور سپہ سالار افشین کی بغاوت سے صاف ظاہر ہو جاتا ہے کہ ان سب لوگوں کا مقصد ایک تھا۔ یعنی عربوں کی حکومت کے بجائے عجمی حکومت کا قیام! اگرچہ یہ تحریکیں اسلامی حکومت کو پوری طرح مٹانے میں کامیاب نہیں ہو سکیں۔ لیکن مسلمانوں کی سیاسی قوت کو ضعیف کرنے میں ان کا بہت بڑا حصہ ہے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کے معتقدات پر انہوں نے گہرا اثر ڈالا۔ اور مجوسی افکار اسلامی عقائد کے جسم میں پیوست ہو گئے۔ عباسیوں کے عہد کے بعد اکثر فتنے بالکل مٹ گئے۔ تاتاریوں کے فتنے نے جہاں عباسیوں کی شمع گل کر دی۔ وہاں باطنیوں کا زور بھی توڑ ڈالا۔ لیکن یہ غیر اسلامی عقائد تصوف کے ذریعے سے برابر نئے نئے قالبوں میں ڈھلتے اور اہلِ خانقاہ کے توسط سے عام مسلمانوں میں پھیلتے رہے۔

ہمارے صوفیا میں ایک تو ارباب حق کا وہ گروہ ہے جس کا مقصد محض تبلیغ دین تھا۔ علما نے ہمیشہ لوگوں کو خدا کے قہر و غضب سے ڈرایا اور صوفیوں نے ہمیشہ اس کے جمالِ رحمت اور رأفت

کو بے نقاب کرکے لوگوں کے دلوں میں محبتِ الٰہی کا بیج بونے کی سعی کی۔ لیکن اس کے علاوہ مدّعیانِ تصوّف کی ایک دوسری جماعت بھی تھی جو اسلام کو دوسرے مذہب کے عقائد سے تطبیق دینے کی کوشش کر رہی تھی۔ متصوّفین کے اس گروہ کی کوشش نے اِن غیر اسلامی معتقدات کو نئی شکلوں میں نمودار کر دیا۔ یعنی وحدتِ وجود کے ساتھ ساتھ وحدتِ شہود کا تصوّر پیدا ہوا۔ اور حلول نے ظلّ و بروز کی صورت اختیار کر لی۔ راوندیہ منصور کے متعلق کہتے تھے کہ اس کے قالب میں خدا کی روح حلول کر گئی ہے۔ بعد میں بادشاہ کو ظلّ اللہ کہا جانے لگا۔ اور اولیاء کو انبیاء کا ظلّ و بروز۔ پھر جس طرح خدا کے تمام اوصاف بادشاہوں سے منسوب ہونے لگے اسی طرح اولیاء میں نبوّت و رسالت کی تمام خصوصیات پیدا کر لی گئیں۔

یہ حالت کئی سو سال تک رہی۔ آخر سولھویں اور سترھویں صدی کا وہ زمانہ آیا جب کہ مسلمانوں کی سیاسی قوت میں زوال رونما ہو چکا تھا، اور اقوامِ فرنگ مشرقی ممالک میں آہستہ آہستہ قدم بڑھا رہی تھیں وہابی تحریک جو دین کے باب میں اپنے تشدّد اور غلو کے اعتبار سے خوارج کی تحریک سے یک گونہ مشابہت رکھتی ہے۔ اسی زمانے میں عالمِ وجود میں آئی۔ وہ عجمی اثرات کے خلاف عربوں کی سادگی کی ایک پُر زور بغاوت تھی۔ جس سے کم و بیش سارا عالمِ اسلام متأثر ہوا۔ لیکن اس عہد میں سلالہ عثمانی اور دودمانِ بابری کی روحِ عظمت مِٹ چکی تھی۔ ڈیڑھ سو سال کے اندر اندر اِدھر اکبر اور جہانگیر کا گھر بے چراغ ہو گیا اور اُدھر سلطنتِ عثمانیہ کا تاجدار دولِ فرنگ کے ہاتھوں میں محض ایک کٹھ پتلی بن کر رہ گیا۔

نئی تحریک کا نشو و ظہور اسلامی حکومت کے زوال اور اقوامِ فرنگ کے اِس غلبہ و استیلا کا لازمی نتیجہ تھا۔ ایران میں جو مجوسیّت کا گہوارہ تھا مزدکی اور مانوی عقائد پھر ابھرنے لگے اور بابیت کے پیکر میں نمودار ہوئے۔ ہندوستان میں سید احمد بریلوی اور شاہ اسماعیل شہید نے خالص اسلامی حکومت قائم کرنے کے ارادے سے عَلَمِ جہاد بلند کیا۔ اگرچہ انہیں اس مقصد میں ناکامی ہوئی۔ تاہم مسلمانوں پر ان کی تحریک کا نہایت خوشگوار اثر پڑا۔ اور ان کے متبعین کی ایک ایسی جماعت پیدا ہو گئی۔ جو برابر غیر اسلامی حکومت اور غیر اسلامی عقائد کے خلاف بغاوت کرتی رہی۔ اس زمانے میں دہلی کے تخت پر ایک برائے نام فرماں روا موجود تھا۔ ۱۸۵۷ء میں ہندوستان کی اسلامی حکومت کا یہ آخری نشان بھی مِٹ گیا۔

یہ زمانہ مسلمانوں کے جذبات کی شورش اور اضطراب کا ایک ہیجانی دَور تھا۔ دہلی کی حکومت

برائے نام سہی بہرحال وہ مسلمانوں کی ہشت صد سالہ حکومت کی یادگار تھی۔ اس کا مٹنا آلِ بابر کی عظمت و سطوت کا مٹنا تھا۔ اس لئے مسلمانوں کو اس برائے نام حکومت کے چھن جانے کا سخت صدمہ تھا اور وہ اپنے دلوں میں انگریزوں کے خلاف ایک عمیق جذبۂ نفرت محسوس کر رہے تھے۔ انگریزوں نے ان کے جسم مسخر کر لئے لیکن وہ ابھی تک ان کی روح کو مغلوب نہ کر سکے۔ یہ صحیح ہے کہ مسلمان بے بس اور مجبور تھے۔ اور انگریزی حکومت کے خلاف بغاوت کر دینا ان کے لئے تقریباً ناممکن تھا لیکن انہوں نے اپنی دلی نفرت کے اظہار میں کبھی تامل نہیں کیا۔ یعنی اس زمانے میں جب ہندو انگریزی تعلیم حاصل کر کے سرکاری عہدوں پر قبضہ کر رہے تھے۔ مسلمانوں نے مقاطعہ اور عدم تعاون کی راہ اختیار کی اور انگریزی زبان اور انگریزوں کی ملازمتوں سے کوئی سروکار نہ رکھا۔ کیونکہ ان کے نزدیک اپنے جذبات کے اظہار کا اس سے زیادہ موزوں کوئی طریقہ نہ تھا۔ سید احمد بریلوی اور شاہ اسمٰعیل شہید کے پیرو جو عام طور پر وہابی کے نام سے مشہور تھے۔ اس طریقہ پر قناعت کرنا نہیں چاہتے تھے چنانچہ انہوں نے شمالی و مغربی سرحد اور بنگال میں شورش برپا کر دی۔ اگرچہ یہ شورش ایسی خطرناک نہیں تھی کہ انگریزوں کے حاکمانہ اقتدار کو کوئی شدید نقصان پہنچا سکتی۔ لیکن اس سے ملک کے عام اضطراب میں اضافہ ہو گیا۔ اور انگریزی حکومت کے لغت میں لفظ "وہابی" خوفناک باغی اور مذہبی دیوانے کا مرادف سمجھا جانے لگا۔

اس قسم کے یاس انگیز موقعوں پر لوگ خود اپنی طبیعت کی تسکین کا کوئی سامان پیدا کر لیا کرتے ہیں۔ جس طرح عیسائیوں کو قسطنطنیہ کی فتح کے موقع پر یہ یقین نہیں آتا تھا۔ کہ بازنطینی حکومت اس آسانی سے مٹ جائے گی اور سلطان محمد فاتح کے داخلے کے وقت بھی وہ پادریوں کی اس روایت میں تسکین کا سامان تلاش کر رہے تھے کہ جب مسلمانوں کی فتح مکمل ہو جائے گی تو دفعۃً سینٹ صوفیہ کی دیوار شق ہو گی۔ ایک فرشتہ ہاتھ میں شمشیر برہنہ لے کر نکلے گا اور سارے مسلمانوں کو قتل کر دے گا۔ اسی طرح اُس زمانے میں مسلمانوں کو یہ یقین نہیں آتا تھا کہ ان کی حکومت اس آسانی سے مٹ سکتی ہے۔ انہیں یہ خیال عام تھا کہ قیامت قریب آگئی۔ عنقریب دجال کا لشکر ساری کائناتِ ارضی پر پھیل جائے گا۔ پھر مہدی کا ظہور ہو گا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام نزول فرمائیں گے۔ اور دجّال کو قتل کر کے از سرِ نو اسلامی سلطنت قائم کر دیں گے۔ بعض لوگ ایسے بھی تھے جو انگریزی ملوکیت کے خدّ و خال میں دجال کے چہرے کی مشابہت تلاش کر رہے تھے۔

ظہور مہدی کے مسئلہ نے وہابیوں میں بھی دو گروہ پیدا کر دیئے تھے۔ ایک[1] جماعت سید احمد بریلوی کو مہدی سمجھتی تھی۔ ان لوگوں کا خیال تھا کہ وہ زندہ ہیں اور پھر کبھی ظہور کریں گے۔ دوسرا[2] گروہ : ایک نئے مہدی کا انتظار کر رہا تھا۔ افغانستان اور شمالی ہند میں فارسی کے بعض قصیدے جنھیں شاہ نعمت اللہ ولی سے منسوب کیا جاتا ہے۔ اور جن میں مہدی کے ظہور کی پیشگوئی کی گئی ہے۔ گھر گھر پھیلے ہوئے تھے۔ یہ خیال بھی عام تھا کہ تیرھویں صدی کے خاتمے پر مجدد کا پیدا ہونا ضروری ہے۔ نواب صدیق حسن خاں بھوپالی اور مولوی عبدالحیٰ نے تجدیدِ دین کے مسئلے اور اس کی ضرورت واہمیت کو لوگوں کے ذہن نشین کرنے میں بہت بڑا حصہ لیا۔ ان دونوں بزرگوں کے مابین اس زمانے میں جو مباحث ہوتے رہے ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ خود بھی مجدد ہونے کے مدعی تھے۔

افغانستان اور روس کے حالات نے بھی مسلمانوں کے اس انتظار و اضطراب میں معتد بہ اضافہ کر دیا اس زمانے میں روس نے آہستہ آہستہ مشرق کی طرف قدم بڑھانا شروع کر دیا تھا۔ اور سینٹ پیٹرز[1] برگ اور لندن کے سیاسی حلقوں میں یہ خیال عام تھا۔ کہ زارِ روس ہندوستان پر حملہ کرنے کے لئے صرف موقع کا منتظر ہے۔ دفعۃً خبر آئی کہ روس نے تاشقند۔ مرو اور خیوا پر قبضہ کر کے اپنی سلطنت کو دریا کے جیحوں تک پھیلا دیا ہے۔ انگریز پہلے ہی مسلمانوں سے بدظن تھے۔ اس واقعہ نے انہیں زیادہ بدگمان کر دیا۔ جہاد کا مسئلہ ان کے لئے سب سے زیادہ تشویش وفکر کا باعث بنا ہوا تھا۔ اس کے علاوہ ظہور مہدی کے مسئلے کی سیاسی حیثیت بھی ان کے پیشِ نظر تھی۔ سوڈان میں وہ ایک مہدی کی فوق العادت قوت کا مشاہدہ کر چکے تھے۔ اور ابھی تک وہ اپنے وسیع ذرائع و وسائل کے باوجود مہدی سوڈانی علیہ رحمتہ اور ان کے درویشوں کو کچلنے میں کامیاب نہیں ہو سکے تھے۔ کلکتے کے ایوانِ حکومت میں ہندوستان کا برطانوی نائب السلطنت اور اس کے مشیر سخت اضطراب کے عالم میں ایک دوسرے سے پوچھ رہے تھے کہ ایک مہدی نے ہندوکش کی بلندیوں سے اتر کر جہاد کا پرچم بلند کر دیا تو ہم کیا کریں گے؟ روس یقیناً اس موقع سے فائدہ اٹھائے گا۔ افغانستان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ باقی رہے ہندوستان کے مسلمان تو جہاد کے نعرۂ عام کے بعد شاید وہ بھی بغاوت پر آمادہ ہو جائیں۔ اس وقت ہر شخص کی زبان پر یہ چار الفاظ تھے۔ مہدی۔ جہاد۔ روس، اور امیرِ کابل! اور ہندوستان کے نائب السلطنت کی زبان بھی انہیں الفاظ کے اعادہ و تکرار کے لئے وقف ہو چکی تھی۔

---

[1] سینٹ پیٹرز برگ اس زمانے میں روس کا دارالسلطنت تھا۔

اسی زمانے میں ڈاکٹر ہنٹر نے اپنا مشہور رسالہ "انڈین مسلمانز" لکھا جس میں انہوں نے سلطنت اور امارت کے باب میں مسلمانوں کے معتقدات بیان کر کے حکومت کو مشورہ دیا تھا کہ اسے مسلمانوں کی جانب سے کبھی مطمئن نہ ہونا چاہیئے۔ کیونکہ یہ قوم مذہبًا اس امر پر مجبور ہے کہ کسی غیر مسلم فرماں روا کی اطاعت قبول نہ کرے۔ سرسید احمد خان نے اس کے رد میں "اسباب بغاوت ہند" کے نام سے ایک رسالہ لکھا سرسید پہلے ہی مسلمانوں کے لئے یہ ضروری سمجھتے تھے کہ وہ محکومی کی موجودہ حالت پر قناعت کر کے اپنی اندرونی اصلاح اور تعلیم کے مسئلے پر اپنی تمام توجہات صرف کر دیں۔ "انڈین مسلمانز" کے بعد ان کے خیالات زیادہ پختہ ہو گئے۔ اور وہ انگریزوں اور مسلمانوں کے مابین بہتر تعلقات قائم کرنے کی کوشش کرنے لگے۔ ساتھ ہی انہوں نے اسلام کو علوم جدیدہ کے مطابق کرنے کی سعی کی۔ مسئلہ جہاد کی تاویل کی۔ ظہور مہدی کے مسئلہ کا سختی سے انکار کیا۔ اور اشاعت تعلیم کی کوششوں میں مصروف ہو گئے۔ لیکن سرسید مرحوم کا مقصود نہ تو یہ تھا کہ انگریزوں کے اقتدار کو کوئی فائدہ پہنچایا جائے۔ نہ وہ اپنے لئے کوئی دنیوی عزت حاصل کرنا چاہتے تھے۔ بلکہ انہوں نے انگریزوں کے تعاون کی راہ محض اپنی قوم کی فلاح و بہبود کے لئے اختیار کی تھی۔ وہ سالہا سال تک حکومت کے ملازم رہنے کے باوجود اپنے قلب میں حکومت کی اطاعت کا ایسا ذوق پیدا نہیں کر سکے تھے کہ اس کے سامنے کوئی سچ بات کہنے میں جھجک محسوس کر سکیں۔ "اسباب بغاوتِ ہند" میں انہوں نے جس جرأت اور بے خوفی سے حکومت کے حال پر نکتہ چینی کی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ ان کے دل پر حکومت کی وفاداری کا نقش زیادہ گہرا نہیں تھا۔ انگریزوں کے نقطۂ نگاہ سے سرسید احمد خان جیسا شخص چنداں مفید نہیں تھا۔ انہیں ایسے شخص کی ضرورت تھی جو مذہب کے حربے سے لوگوں کے دلوں پر ان کی وفاداری اور اطاعت منقوش کر دے۔ دنیوی فرماں رواؤں نے مذہب کو ہمیشہ اپنے مقاصد کے لئے استعمال کیا ہے۔ انگریز اپنے ملک میں مذہب کو ایک کارآمد سیاسی حربے کی حیثیت سے استعمال کر چکے تھے۔ کوئی وجہ نہیں تھی کہ ہندوستان جیسے ملک میں جہاں کے باشندوں کے دلوں پر مذہب کی گرفت مضبوط رہی ہے۔ یہی حربہ استعمال نہ کیا جائے۔ اگر افریقہ میں ایک جہاد کی دعوت دینے والا مہدی سوڈانی ہو سکتا ہے۔ تو یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہندوستان میں حکومت کی وفاداری کا وعظ کرنے والا مہدی پیدا کر دیا جائے۔

غرض مرزا غلام احمد قادیانی نے جب اپنی تحریک کا آغاز کیا۔ تو اس کی نشو ونما کے لئے بے حد مساعد حالات اور سازگار فضا مہیّا ہو چکی تھی۔ ابتداء میں وہ ایک اسلامی[1] مبلغ کی حیثیت سے روشناس خلق ہوئے۔ پھر انہوں نے اپنے آپ کو چودھویں صدی کا مجدد کہنا شروع کیا اور اس دعوے کے لئے انہیں کوئی تردّد نہ کرنا پڑا۔ کیونکہ لوگوں کے کان تجدیدِ دین کے دعوے سے پہلے ہی آشنا ہو چکے تھے اور خود اس زمانے میں ایک سے زیادہ مدعیانِ تجدید موجود تھے۔ ہاں ان لوگوں کو الہام کا دعویٰ نہیں تھا۔ میرزا صاحب نے الہام کا دعوٰے بھی کیا۔ اور اس خیال سے کہ یہ دعوائے الہام لوگوں کو برہم نہ کرے اور وہ کہیں بے قابو نہ ہو جائیں۔ انہوں نے اپنے اس اِدّعا کو آریہ سماجیوں اور عیسائیوں کے مقابلے میں اسلام کی صداقت کی دلیل کے طور پر پیش کیا۔ یہ تدبیر بہت کارگر ثابت ہوئی۔ اکثر مسلمان علماء یہ سمجھ کر خاموش رہے کہ میرزا غلام احمد کے اِدّعائے الہام سے انکار کرنا گویا اپنے کو اسلام کی صداقت کی ایک عمدہ دلیل سے محروم کر دینا ہوگا۔ اب میرزا صاحب نے آگے قدم بڑھایا۔ یعنی مہدویت کا دعویٰ کر دیا۔ اور ظہورِ مہدی کے متعلق جو محلِّ نظر روائتیں احادیث میں موجود ہیں ان سے استناد کرنے لگے۔ اس دعوے کا ثبوت فراہم کرنے میں انہیں بہت سی ضعیف اور ناقابلِ اعتماد حدیثوں سے مدد ملی جو مجوسیوں نے اپنے غلبہ و استیلاء کے زمانے میں وضع کر لی تھیں۔ اور جن کا مفہوم یہ تھا کہ مہدی عجمی النسل ہوگا۔

خراسان سے مہدی کا ظہور، مہدی کا ابنائے فارس میں سے ہونا، مہدی کا حضرت سلمانؓ فارسی کی نسل میں سے ہونا۔ اسی قسم کی حدیثیں ہیں۔ میرزا صاحب مغل تو تھے ہی۔ انہوں نے فوراً اپنا سلسلۂ نسب سلمان فارسیؓ سے ملا دیا۔

مسلمان عیسائیوں کے غلبے کو دجّال کے خروج کی نشانی سمجھتے تھے۔ بلکہ بعض لوگوں کا خیال تھا کہ

---

[1] راقم الحروف کے نزدیک میرزا صاحب کا ذوقِ تبلیغ بھی سیاسی مصالح کی پیداوار ہے۔ انگریزی حکومت کے استحکام کے لئے یہ ضروری تھا کہ مختلف مذاہب کے لوگوں کو آپس میں لڑایا جائے۔ اور میرزا غلام احمد اور سوامی دیانند نے یہ خدمت جس خوش اسلوبی سے انجام دی ہے اس کی تفصیل غیر ضروری معلوم ہوتی ہے۔ (حسرت)

دجّال سے انگریز مُراد ہیں۔ میرزا صاحب نے اس عام خیال سے فائدہ اٹھا کر انگریزوں کو دجّال کہنا شروع کر دیا۔ ساتھ ہی انہوں نے "مسیحیت" کا دعویٰ کیا اور اپنے آپ کو ظلّی و بروزی نبی کہنے لگے اور فنافی الرّسول کے صوفیانہ عقیدے کا جوڑ ظلّ و بروز سے ملا دیا۔ اور جب وہ اچھی خاصی جماعت فراہم کر چکے تو ظلّی نبی کی بجائے اپنے لئے "نبی" کی اصطلاح آزادانہ استعمال کرنے لگے۔

یہ عجیب بات ہے کہ میرزا صاحب کے حلقۂ ارادت میں سب سے پہلے وہی لوگ شامل ہوئے جو فرنگی دشمنی کے باعث ہندوستان بھر میں مشہور تھے۔ یعنی وہابی جماعت کے لوگ جو حق در حق ان کے مریدوں میں شامل ہونے لگے۔ مہدویت اور مسیحیت کا دعویٰ کرنے سے پہلے خود میرزا صاحب اپنے عام عقائد کے اعتبار سے وہابی تھے۔ لیکن ان کی وہابیت پر تصوّف کا گہرا رنگ چڑھا ہوا تھا ان کے افکار میں کہیں کہیں وحدتِ وجود کی جھلک بھی پائی جاتی ہے۔ اور وہ خدا کے تجسّم و تشبّہ کے بھی قائل معلوم ہوتے ہیں۔

خدا کا یعقوبؑ سے کشتی کرنا، اور حضرت ابراہیمؑ کا خدا کو ممرے کے بلوطوں میں دیکھنا یہود کے عام معتقدات میں سے ہے۔ میرزا صاحب کا عقیدہ بھی توحید و تنزیہہ کے اسلامی عقیدہ کے بجائے یہود کے اس عقیدۂ تجسّم سے ملتا جلتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے ایک مرتبہ خدا کو تیندوے کی صورت اور دوسری جگہ ہاتھی دانت کی شکل میں پایا اس کے علاوہ انہوں نے اُسے بیداری کی حالت میں کاغذات پر دستخط کرتے بھی دیکھا۔ چنانچہ سب قدرت کی روشنائی سے میرزا صاحب کے کپڑے غدار ہو گئے۔

میرزا غلام احمد کے عقائد پر غور کیجئے تو معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں جتنے باطل تصوّرات پیدا ہوئے وہ سب اپنی ایک ترقی یافتہ صورت میں میرزا صاحب کے ہاں موجود ہیں۔ ان میں ذہانت کا ظاہر تو ہے لیکن اس کے باطن یعنی ذوقِ جہاد سے سروکار نہیں۔ وہ سرے سے جہاد بالسّیف کے منکر ہیں۔ اور انگریزی حکومت کو واجب الاطاعت سمجھتے ہیں۔ وہ صوفی بھی ہیں۔ لیکن ان میں نہ تو صوفیوں کی سی فراخ دلی اور وُسعتِ نظر ہے نہ بے نیازی اور قناعت، وہ اپنے منکروں کو کافر کہتے ہیں اور اپنے مخالفوں کو بے دریغ گالیاں دیتے ہیں کوئی جھجک محسوس نہیں کرتے۔ انہوں نے تصوّف کے صرف عقائد کو قبول کر لیا۔ جو مجوسی عقائد کی صدائے بازگشت معلوم ہوتے ہیں۔ اور جنھیں اسلامی

تصوف سے کوئی تعلق نہیں، یعنی ظل و بروز، تشبیہ و تجسم اور وحدتِ وجود[1] ان پر بابی تحریک کا بھی کافی اثر پڑا۔ چنانچہ چند مسائل کو مستثنیٰ کر دیجئے تو ان کے اور محمد علی باب کے دعوے میں کوئی فرق نہیں رہتا۔ وفاتِ مسیح کا عقیدہ جس پر ان کے دعوے کی عمارت استوار ہے۔ انہوں نے سر سید احمد خان سے لیا ہے۔ اسلامی عقائد کی نئی تعبیر و تفسیر اور علوم جدیدہ سے ان کی تطبیق کے باب میں بھی وہ سر سید کے متبع ہیں۔ لیکن ان کی تحریک میں جو چیز سب سے نمایاں نظر آتی ہے وہ تنسیخ جہاد اور انگریزوں کی خلافتِ الٰہیہ کے مسائل ہیں۔ ان کی کتابوں میں کوئی دوسرا مسئلہ ایسا نہیں جس کا ذکر انہوں نے اس جوش و خروش کے ساتھ بار بار کیا ہو۔ ان کے خیالات میں تضاد و تباین بے حد ہے۔ وہ خود اپنے دعاوی کے متعلق ایسی متضاد باتیں کہتے ہیں کہ پڑھنے والا پریشان ہو جاتا ہے۔ لیکن تنسیخ جہاد اور حکومت انگریزی کی اطاعت کے متعلق انہوں نے جو کچھ لکھا ہے وہ ہر قسم کے ابہام و تضاد سے پاک ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان مسائل کو اصل کی حیثیت حاصل ہے۔ اور دوسرے تمام مسائل حتیٰ کہ ان کا دعوائے مہدویت بھی فرع کی حیثیت رکھتا ہے۔

بقیہ از صفحہ ۱۳

خدائی خوشنودی کے اہم عنصر کو نظر انداز کر دیا ہے۔ یعنی مخلوق خدا کی خدمت کا کوئی اہم کام سر انجام نہیں دیا جاتا۔

روزے کی نماز کی طرح وہ گونہ غایت ہے۔ تعلق باللہ بڑھ جانا اور مخلوق میں مساوات کا پیدا کرنا۔ انسانوں میں عدم مساوات کے حق میں عقل فتویٰ نہیں دیتی لیکن گمراہ دل دوسروں پر مجلسی اور اقتصادی فوقیت چاہتا ہے۔ نماز اور روزے ان انانیتوں اور بے جا سرکشیوں کو دل سے نکال پھینکتے ہیں۔ دلِ عقل کو پھر گمراہ نہیں کرتا۔ اللہ کا تعلق طبیعت میں انکسار پیدا کرتا ہے۔ یہ بات کثرتِ عبادت سے حاصل ہو جاتی ہے لیکن احتیاطاً ساتھ روزے کی ریاضت بھی شامل کر دی تاکہ بھوک کا دکھ نظر سے اوجھل نہ ہو اور بھوک کی ماری مخلوق کے حال سے انسان بیگانہ نہ ہو۔

---

[1] جدید تحقیق سے ثابت ہو گیا ہے کہ بابی تحریک روس کے سیاسی مصالح کی پیداوار تھی۔ (حسرت)